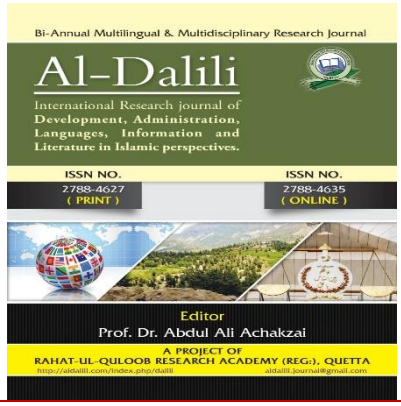

OPEN ACCESS

This work is licensed under a Creative Commons Attribution 4.0 International License

AL DALILI

Bi-Annual, Multilingual (Arabic, Balochi, Birahvi, English, Pashto, Persian,Urdu)

ISSN: 2788-4627 (Print), ISSN: 2788-4635 (online)

Project of **RAHATULQULOOB RESEARCH ACADEMY,**

Jamiat road, Khiljiabad, near Pak-Turk School, link Spini road, Quetta, Pakistan.

Website: www.aldalili.com

Approved by Higher Education Commission Pakistan

Indexing: » IRI (AIOU), Tahqeeqat, Euro pub, MIAR.

TOPIC

محمد عاصم بٹ کے افسانوی کرداروں پر وجودی اثرات: خصوصی مطالعہ

Muhammad Asim Butt's Existential Impact on Fictional Characters: A special study

AUTHOR

1. Dr. Mir Yousaf Mir, Assistant Professor, Department of Urdu University of Azad Jammu and Kashmir, Muzaffrabad, Pakistan.
   Email: muhammad.yousaf@ajku.edu.pk
2. Saira Qayum, Lecturer (V) Department of Urdu University of Azad Jammu and Kashmir Muzaffarabad. Email: Sairaqayyummughal786@gmail.com
3. Aqib Shazad, Lecturer urdu, Govet.Boys Inter College Therian, Azad Jammu and Kashmir Muzaffarabad. Email: aqibshahzad72@gmail.com

How to Cite: Dr. Mir Yousaf Mir, Saira Qayum, & Aqib Shazad. (2022). URDU: محمد عاصم بٹ کے افسانوی کرداروں پر وجودی اثرات: خصوصی مطالعہ: Muhammad Asim Butt's Existential Impact on Fictional Characters: A special study. *Al-Dalili*, *4*(1), 15–22. Retrieved from https://aldalili.com/index.php/dalili/article/view/82

Vol.4, No.1 || July–December 2022 || URDU: Page. 15-22

Published online: 09-08-2022

QR. Code

محمد عاصم بٹ کے افسانوی کرداروں پر وجودی اثرات: خصوصی مطالعہ

Muhammad Asim Butt's Existential Impact on Fictional Characters: A special study

[1]میر یوسف میر [2]سائرہ قیوم [3]عاقب شہزاد

ABSTRACT:
The researcher has conducted his distinctive study on one of the significant aspects of Urdu Literature. The title is an explicit indication of his empirical adventure "Muhammad Asim Butt's Existential Impact on Fictional Characters". The researcher has done his efforts for relating the fictional characters to real life. The research work is unique in its nature; however, there is huge space for further unveiling the several layers of fictional avenues. This scientific work can be termed very valuable asset for the future researchers.
Key words: Distinctive, Existential, Impact, Fictional, Unveiling, Valuable, Asset.

محمد عاصم بٹ کے دو افسانوی مجموعے "اشتہار آدمی" اور "دستک" چھپ چکے ہیں۔ عاصم بٹ کی کہانیاں موجودہ دور سے متعلق ہیں۔ جدید دور میں فرد کو جن مسائل کا سامنا ہے اور زندگی کے تلخ رویوں کا بھرپور احساس ان کے افسانوں میں نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عاصم بٹ کو ایک رومانوی نہیں بلکہ حقائق پر گہری نظر رکھنے والا اور زندگی کے المیاتی پہلوؤں پر نظر رکھنے والا افسانہ نگار شمار کیا جاتا ہے۔

عاصم بٹ کے افسانوں میں اپنے عہد کے وجودیاتی مسائل میں گرفتار اور پھر ان مسائل کے حل کے لیے جہد و عمل کرتے دکھائی دینے والے کردار نظر آتے ہیں۔ یہ کردار دراصل اپنے ارد گرد چار سو پھیلے ہوئے آشوب میں گھرے ہوئے اور ڈراؤنے خوابوں سے جاگ اٹھنے والے، نفسیاتی دباؤ تلے سسکتے ہوئے اور ان سے نجات نہ ملنے کی صورت میں زندگی سے بیزار افراد ہیں۔ یہ کردار کبھی کبھار ہیاپنے ناموں کا اعلان کر پاتے ہیں۔ عاصم بٹ کے تخلیق کردہ یہ کردار بے نام تو نہیں ہیں مگر اجتماعی زندگی کی جبریت کے سامنے اپنی انفرادی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے کے باوجود اپنے آپ کو اور اپنے ناموں کو بامعنی کرداروں کی صورت میں ظاہر نہیں کر پاتے۔ اجتماعیت کے بوجھ تلے دبے ہوئے کردار، جو اپنی انفرادیت کو اجتماعیت سے منوانے میں ناکام رہتے ہیں۔ ڈاکٹر نوازش علی کے بقول:

"مسخ شدہ، عدم تحفظ کا شکار اور خوف میں مبتلا افراد واہموں کی صورت میں زندگی کی منفی شکلوں کو دیکھتے ہیں اور پچکتے دبتے چلے جاتے ہیں۔ مہملیت اور لغویت سے پُر زندگی کے نوحے پڑھتے ہوئے کردار عاصم بٹ کے افسانوں میں اپنے ناموں کے ساتھ وارد ہوتے ہیں اور بے نام ہو کر کہیں دھند میں غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ کم مایہ اور بے وقعت زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔"[1]

"اشتہار آدمی" محمد عاصم بٹ کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ 112 صفحات پر مشتمل اس مجموعہ میں کل 6 کہانیاں شامل ہیں۔ عاصم بٹ نے فلسفہ میں ایم۔ اے کیا تھا، اس طرح اُن کی فلسفیانہ مسائل پر دسترس قابلِ داد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عاصم بٹ کے افسانوی کرداروں میں زندگی کی قبولیت کی بجائے زندگی سے اکتاہٹ کا رویّہ جنم لیتا ہے۔ وہ وجودی تذبذب سے دوچار ہیں۔ یہ کردار کبھی ایسے خواب دیکھتے ہیں جن میں انہیں وہ کچھ حاصل کرنے کی سہولت میسر آتی ہے، جسے وہ جیتی جاگتی زندگی میں حاصل نہیں کر پاتے۔ کہیں یہ پُر شور ڈراؤنے خواب دیکھتے ہیں

اور جاگتے میں اکثر و بیشتر واہموں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے واہموں میں دوسرے افراد کو اپنی دبی ہوئی خواہشات کے مطابق عمل آرا دیکھتے ہیں۔ ''اشتہار آدمی'' کے مرکزی کردار کو اس عمل آرائی میں خاص طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کہانی کے بڑے کینوس پر اشتہاروں کی آنکھ سے اپنے خواب بنانے والا ایک ایسا نوجوان ہے جس کی بنیادی کمزوری تو اس کی اقتصادی حالت ہے، نیچے سے اوپر پہنچنے کے لیے اس کے پاس خواب تو ہیں، کوئی زینہ نہیں۔

یہ اس مجموعہ کی واحد کہانی ہے جہاں ہیرو کا براہِ راست مسئلہ تنہائی یا جبر کے نتیجے میں پیدا شدہ خود غرضی، بیگانگی اور بے شناخت ہونے کا دکھ نہیں بلکہ یہاں دکھ مختلف ہے کہ کم ہوتے ہوئے وسائل نے فرد کو زندگی کی دوڑ میں لا کھڑا کیا ہے، جہاں اس کی ضروریات، جو محض اس کی خواہشات کا مقصد تھیں، انھیں زندگی کا لازمی حصہ بنا دیا گیا ہے۔

''تیز بارش میں ہونے والا ایک واقعہ'' کا مرکزی ہیرو ''حمید ناصر'' کی زندگی سے اکتاہٹ اور بیزاری جھلکتی نظر آتی ہے۔ تاہم ایک بوڑھی خاتون کے مر جانے پر وہ چونکتا ہے۔ گویا اسے کچھ دیر کے لیے احساس ہوتا ہے کہ اس کا ماضی ناکارہ ہو چکا ہے۔ وہ اس مرتی ہوئی عورت کی کوئی مدد نہیں کر سکتا ہے۔

کہانی میں 'حمید ناصر' وہ مرکزی کردار ہے جو ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں سے جڑت رکھتا ہے۔ تاہم وہ وقت کی ناگزیریت اور جبریت کو بدلنے سے قاصر رہتا ہے۔ وہ آنے والے واقعات کا ادراک رکھتے ہوئے بھی وقت کے ہاتھوں بے بس اور لاچار ہے۔ وہ جانتا تھا کہ معصوم بچی جو اپنی آنکھوں میں مسرت کی چمک لیے، باپ کی ٹانگوں سے لپٹی اسے دیکھ رہی ہے، اگلے مرحلے میں پیش آنے والے واقعہ میں زندگی کی بازی ہار جائے گی لیکن کرب اور بے بسی کی یہ کیفیت اس سے قوتِ فیصلہ چھین لیتی ہے۔ اور وہ بچی کے باپ کو کچھ بھی بتائے بغیر لوٹ آتا ہے۔

''شکاری'' ایک ریٹائرڈ شخص کا قصہ ہے جو رنگ برنگی تتلیوں اور مچھلیوں کا شکار کرنا چاہتا ہے۔ ایسی تتلیاں اور مچھلیاں جو لافانی ہوں۔ اس کہانی کا پیرائیہ اظہار علامتی ہے۔ ریٹائرڈ شخص گویا زندگی کی گہما گہمی سے نکل چکا 'فرد' ہے اور مچھلیاں اور تتلیاں تخلیقی احساس ہے یا ایسی تخلیق کی علامت ہیں جو لافانی ہو جائے۔ ''شکاری'' کا ہیرو بھی 'حمید ناصر' کی طرح زندگی سے کٹ کر اس کے ثمرات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جو کہ ممکن نہیں۔ عاصم بٹ نے اس معاشرتی رویے کو ان دو کرداروں کے ذریعے سے بڑی خوبی سے دکھایا ہے کہ کیسے اس نئے عہد میں، کہ جب زندگی کی تیز رفتاری بڑھ چکی ہے، ہماری ایک خاص کلاس بے عملی کا شکار رہتے ہوئے زندگی کی آسائشوں سے محظوظ ہونا چاہتی ہے۔ تاہم شکاری کا کردار جب یہ احساس کر لیتا ہے کہ زندگی حرکت میں ہے تو وہ ایک سفر پہ روانہ ہونے کی خواہش کرتا ہے۔ البتہ وہ ایک ایسی خیالی دنیا بسا لیتا ہے جہاں اس کے نام کا ڈنکا جب رہا ہو اور وہ وقت کے سفر میں آچکا ہو۔ بقول کامران کاظمی:

''ایک ایسا کردار ہے جو کہ جب متحرک تھا بھی تو زندگی سے کچھ نہ کشید کر سکا اور اب ریٹائرڈ ہو جانے کے بعد اسے لافانی ہونے کی لایعنی خواہش نے اپنا اسیر بنا لیا اور اب وہ اپنے موجودہ حالات سے فرار کی راہ تلاش کر رہا ہے۔''[2]

''خواب کہانی'' کے کرداروں سے روایتی ہیرو اور ولن کے کرداروں سے سماجی تضاد ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن افسانے کے دونوں کردار اچھائی یا برائی کا کوئی فکری تصور پیدا نہیں کر سکے، کہ اگر ایک کردار گم ہو جاتا ہے تو ہیرو جو کہ بظاہر خیر کا نمایندہ ہے وہ بھی بے اثر

ہو جاتا ہے اس طرح اس کہانی کا بڑا کردار جمود کا شکار نظر آتا ہے۔ ''شکاری'' کے ہیرو کی مانند وہ خود سے کوئی فعل انجام نہیں دیتا۔ ہاں البتہ ان دونوں کرداروں میں ایک وجودی عنصر مشترک ہے وہ یہ کہ جس طرح ''شکاری'' کے ہیرو کے ہاں زندگی لغو بن کر رہ گئی ہے وہی صورت یہاں بھی ہیرو کو درپیش ہے کہ اسے ایک ہی طرح کے کردار میں رہنا ہے۔

عاصم بٹ کے افسانوں میں ایک اہم افسانہ ''عہدِ گزشتہ کی کہانی'' ہے۔ اس افسانے کا ہیرو ''وہ'' ہے۔ افسانے میں کردار کا نام غائب ہونا دراصل اس کی شخصیت کا گم ہونا ہے۔ جب سماج میں انسان کے حقیقی وجود کی نفی ہو جاتی ہے تو اس کی شناخت گم ہو جاتی ہے۔ اس کردار کا بنیادی مسئلہ تنہائی اور اجنبیت ہے۔ تاریکی چھا جانے اور سورج گم ہونے کی بے چینی کے چوہے اسے کاٹتے ہیں۔ چوہے خود غرضی کی علامت ہیں جو افراد کے اجتماع کو منتشر کرتے ہوئے ان کی پناہ گاہوں میں خود آ بستے ہیں۔ اس افسانے کے ہیرو کے ہاں خارجی مسائل اس کے داخل کا حصہ بن جاتے ہیں اور زندگی جو کہ اپنی حقیقی شکل میں لغویت کا شکار ہے، پھر بھی اس کہانی کا ہیرو چوہوں اور تاریکی کے خلاف کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح یہ تاریکی چھٹ جائے۔

اس افسانے میں فرد کی بیگانگی اور زندگی کی لغویت و یکسانیت کے باوجود مرکزی کردار عملی کوشش کا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔ کامران کاظمی کہتے ہیں:

''اس کہانی کا کردار بے مقصد اور اجنبیت کا شکار زندگی میں سورج کی خواہش رکھتا ہے اور چوہوں سے نفرت کرتا ہے۔ گویا وہ سمجھوتہ نہیں کرتا۔''3

اس کہانی میں سے 'پس نوشت' میں ایک اور کردار سامنے آتا ہے جو چوہوں کی وجہ سے ایک موت کا خود کو ذمہ دار سمجھتا ہے اور اب چوہے مارنے کا عہد کرتا ہے مگر یہ کردار تضاد کا شکار ہے کہ موت کی وجہ سے تہہ خانے سے باہر تک تو آتا نہیں اور محض اپنا احساسِ گناہ کم کرنے کے لیے خود کو تمام چوہے مار دینے کے وعدے سے بہلا رہا ہے۔

''اشتہار آدمی اور دوسری کہانیاں'' کی آخری کہانی ''گڑھے کھودنے والا'' ہے۔ کہانی کے ہیرو وجودی مسئلہ زندگی سے بیزاری اور اس کی یکسانیت باقی کہانیوں کے کرداروں جیسا ہی ہے۔ تاہم اس کی ذہنی علمی سطح باقی کرداروں سے کم ہے۔ اس کا رویہ یہ ہے کہ زندگی کی یکسانیت ہی اسے زندگی دے سکتی ہے۔ اس کی زندگی میں اپنے دائمی مسئلے کے خلاف اگر کوئی رویہ بیدار ہوتا بھی ہے تو وہ اس سر درد کو والیم فائیو کی گولیاں کھلا کر ضبط کر لیتا ہے اور پنپنے نہیں دیتا۔ درد کی شدت بڑھنے پر اپنے بھیجے میں بارود بھری گولی مار لیتا ہے۔

یہ واحد کردار ہے جو زندگی کی لغویت اور یکسانیت کے خلاف کوئی رد عمل نہیں کرتا اور از خود پیدا ہونے والے رد عمل کو خود ختم کر دیتا ہے۔ ان ۶ کہانیوں کے کردار گو روزمرہ زندگی کے کردار ہیں اور ان میں مشترک باتیں تنہائی، بیگانگی، زندگی سے بیزاری، اکتاہٹ اور اس کی یکسانیت ہیں، جو خالصتاً وجودیاتی مسائل ہیں۔ تاہم بعض کردار اس یکسانیت سے فرار چاہتے ہیں اور کچھ اسے اوڑھ لیتے ہیں۔ یعنی اسی کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر لیتے ہیں۔ مثلاً ''اشتہار آدمی'' اور ''گڑھے کھودنے والا'' کے کردار اپنے معمولات کو حتمی تصور کرتے ہیں اور اس میں تبدیلی کی خواہش تک نہیں رکھتے۔

عاصم بٹ جس طبقے سے ہیرو یا دیگر کرداروں کا انتخاب کرتا ہے وہ اس مخصوص طبقے کی نمائندگی بھی خوب کرتا ہے۔ اگر یہ کردار بیزار، اکتاہٹ زدہ، یاسیت پسند اور زندگی سے فراریت کرتے دکھائی دیتے ہیں تو یہ المیہ معاشرے کا ہے جس میں ایسا سب کچھ موجود ہے۔

عاصم بٹ کا دوسرا افسانوی مجموعہ "دستک" کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل تمام ہی کردار نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمارے دیکھے بھالے ہیں۔ عاصم بٹ اپنے کرداروں اور دنیا کو ایک مشکل زاویے سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ اگر نیا نہیں تو انوکھا ذائقہ ضرور ہے۔ عاصم بٹ کے کردار اپنے عمل میں اپنے طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں مگر اپنے ہونے کی معنویت کے بارے میں ضرور الجھے ہوئے ہیں۔ یہ الجھن کہیں نفسیاتی ہے اور کہیں فلسفیانہ اور کہیں محض ایک پراسرار سی حیرت ہے جو زندگی کے سفر میں ہر حساس آدمی کو آخر آخر ضرور گھیر لیتی ہے۔

عاصم بٹ کے کرداروں میں بظاہر کچھ بھی انوکھا نہیں۔ یہ نہ زیادہ پڑھے لکھے ہیں اور نہ ہی دانشور۔ یہ وہ عام لوگ ہیں جو روٹین کی زندگی گزارتے ہیں اور یہ وہ زندگی ہے جس کی ایک طرح کے دن اور ایک طرح کی راتیں ہوتی ہیں۔ ایک ہی راستہ ایک ہی شہر اور وہی مانوس گلیاں اس پر مستزاد سماجی اور معاشرتی زندگی کے مسائل جو دم نہیں لینے دیتے مگر یہی جمع تفریق کی زندگی ایک طرز احساس کو بھی تو جنم دیتی ہے جس میں کئی پراسرار سوال پوشیدہ ہوتے ہیں اور جو اپنے پیچھے بے معنی سی دھند چھوڑ جاتے ہیں۔

"دستک" کے پہلے افسانے "آخری فیصلہ" کا مرکزی کردار رشید احمد زندگی کی یکسانیت سے اکتایا ہوا اور بے معنویت کے احساس کا شکار ہے۔ وہ سرکاری ادارے میں ایک معمولی کلرک ہے۔ اس کے لیے دفتری ماحول فرسودہ اور کام میں کوئی دلکشی اور تازگی نہیں ہے۔ ہیڈ کلرک کی اسامی خالی پڑی ہے مگر اہلیت کے باوجود اسے ترقی نہیں ملتی کیونکہ اس کے پاس سفارش اور اثر و رسوخ نہیں ہے۔ اس کی نجی زندگی میں بھی کچھ نیا، انوکھا اور دلچسپ نہیں ہے۔ اسے اپنی اسی معمولی نوکری اور کم آمدنی میں ایک بڑے کنبے کی کفالت کے ساتھ ساتھ اپنی بہنوں کی شادیاں بھی کروانی ہیں۔ وہ بہتر زندگی گزارنا چاہتا ہے لیکن آس پاس پھیلے مسائل کا انبار اسے جینے کی بجائے مرنے پر اکساتے ہیں۔ زندگی سے فراریت کو وہ آخری حل سمجھتے ہوئے خودکشی کا ارادہ کرتا ہے۔ بقول منشایاد:

"واجبی شکل و صورت کی بیوی، بہتر زندگی گزارنے کی خواہش کے دشمن بچے، رینگتے، بلبلاتے اور سسکتے ہوئے زندگی گزارنے کا احساس اور شدید ڈیپریشن اسے موت کو گلے لگانے اور خودکشی پر اکسانے پر مجبور کرتا ہے۔"[4]

وہ اپنی زندگی کو جامد و ساکت ہونے کے سبب لغو اور بے معنی سمجھتا ہے۔ اسے ایسا لگتا ہے کہ مسلسل جدوجہد بھی لاحاصل ہے۔ وجودی فلسفی کامیو کے ہاں بھی زندگی کی لغویت کی وجہ مسلسل لاحاصل جدوجہد ہے۔ اس کے نزدیک زندگی کا عمل "سسی فس" کا عمل ہے کہ دیوتاؤں نے سسی فس کو سزا دی تھی کہ وہ ایک چٹان کو لڑھکا کر پہاڑ کی چوٹی تک لے جاتا رہے، جہاں سے وہ پتھریلی چٹان خود اپنے ہی بوجھ سے واپس نیچے گر جائے گی، ان کا خیال درست ہی تھا کہ بے نتیجہ اور امید سے عاری محنت سے زیادہ خوفناک کوئی سزا نہیں۔ پتھر چٹان سے واپس لڑھکتا ہے تو سسی فس کی جدوجہد پھر شروع ہو جاتی ہے۔ ہر فرد زندگی میں اسی قسم کی بے ثمر سعی میں لگا رہتا ہے۔

"نکڑ" کی نجمہ گھر کے جبر اور ماحول کی گھٹن سے فرار حاصل کرنے کے لیے ناولوں میں پناہ لیتی اور بیٹھے بٹھائے خوب صورت اور دولت مند ہیروز کے ساتھ بڑی بڑی کوٹھیوں، قیمتی کاروں، بھاری جوڑوں، غیر ملکی خوشبوؤں اور اعلیٰ سوسائٹی کے ماحول میں پہنچ جاتی ہے۔ اسی

طرح "چالیس سال پر محیط ایک لمحہ" کا چالیس سالہ مرکزی کردار بھی اپنے ماحول سے فرار حاصل کرنے کے لیے اپنے ماضی اور بچپن میں پناہ لیتا ہے۔ وہ اپنی بیوی، گھر کے اور دفتر کے ماحول میں آسودگی نہیں پاتا۔ ہائیڈگر کے نزدیک آسودگی محسوس نہ کرنا ہی کرب ہے۔ اس لحاظ سے ان دونوں کرداروں میں کرب کی کیفیت نمایاں دیکھی جا سکتی ہے۔ ہائیڈگر کے مطابق فرد دنیا میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ نہیں کر پاتا۔ وہ دنیا کے لیے اور دنیا اس کے لیے اجنبی رہتی ہے اور وہ دنیا میں آسودگی محسوس نہیں کرتا۔ نتیجتاً انسان دنیا کے ساتھ یکجائی سے گریزاں ہوتا ہے۔ وہ اپنے ماحول سے فرار چاہتا ہے۔

اس صورتِ حال سے فرار کی کوشش میں کبھی تو وہ خود کو ایک نوجوان لڑکے میں دیکھنے لگتا ہے تو کبھی وہ اپنے بالوں میں اترتی سفید چاندی کو دیکھ کر غم زدہ ہو جاتا ہے۔ یہ دو اقتباسات ملاحظہ ہوں:

"معلوم نہیں کیوں اسے لگا اتنی عمر میں وہ خود بھی ایسا ہی ہو گا۔۔۔ اسے اپنا بچپن یاد آ رہا تھا۔ اس نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ چالیس سال کے بعد انسان میں دانش کا ورود ہوتا ہے۔ وہ دانا بن جاتا ہے۔ اس نے سوچا کیا دانش اور بچپن کا آپس میں کوئی تعلق ہے؟ دانش کی عمر میں بچپن یاد آنے کے کیا معنی؟"[5]

دوسرا اقتباس:

"وہ ہر صبح اپنے سر، داڑھی اور مونچھوں کے بالوں میں سفید تاروں کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد کو حیرت سے تکتا۔ اپنی طرف بہت تیزی سے بڑھتے بڑھاپے کا سوچ کر اسے اپنی گزری زندگی، اور خاص طور پر بچپن شدت سے یاد آتا۔"[6]

"منتظر" کے تینوں کردار شاعر، صحافی اور گورکن کہانی میں ایک ہی خیال کو آگے بڑھاتے ہیں کہ زندگی کہ حقائق کس قدر تلخ اور بھیانک ہیں۔ ان تینوں کو معاشی پریشانیوں کے ساتھ ساتھ جو مسئلہ کھائے جا رہا تھا وہ ہے قلبی اطمینان کا نہ ہونا۔

"روز ایسا ہوتا ہے، قلم ستاتا رہتا ہے، پیالی شاعر کا منہ تکتی ہے اور سگریٹ آپ ہی آپ جل کر راکھ ہو جاتا ہے پر کچھ نہیں ہوتا۔ کبھی اگر کچھ ہو بھی جائے تو شاعر اس سے مطمئن نہیں ہوتا۔"[7]

افسانے کا دوسرا کردار نوجوان صحافی، شاعر جتنا پریشان حال تو نہیں لیکن اس سے کہیں زیادہ غیر مطمئن اور ناآسودہ ہے۔

"اپنے جیسے دوسرے نوجوانوں کی طرح کیسے کیسے خواب اس نے دل میں سجائے تھے۔ دنیا کو بدل دینے، سچ لکھنے، تہلکہ مچا دینے کے خواب۔۔۔ وہ ان خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کا پورا حوصلہ بھی رکھتا تھا لیکن یہ جان پہچان گنجان ٹریفک والی سڑک کی ایسی تصویر کی مانند تھی جس میں دکھائی دینے والا دھواں آپ کو پھیپھڑوں کا کینسر نہیں کرتا۔"[8]

تیسرا کردار یار محمد، گورکن ہے۔ اس کے ہاں مایوسی کی بجائے امید کے دیوں کی لو نظر آتی ہے۔

"حکومت سرکاری ملازموں کی تنخواہیں بڑھانے کا ارادہ رکھتی ہے، اسے امید بندھی تھی۔ اتنے عرصے میں اس کے آثار تو کچھ بھی ظاہر نہیں ہوئے تھے لیکن وہ مایوس نہیں ہوا تھا۔۔۔ سو کسی نہ کسی حیلے سے یار محمد نے امید کے ننھے دیے کی لو کو مدھم نہ ہونے دیا۔"[9]

انسان اپنی خواہشوں کے تکمیل پذیر نہ ہونے کی وجہ سے غم اور مایوسی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اس افسانے کے کردار اس احساس کو ابھارتے ہیں کہ انسان بے کراں دکھوں اور محرومیوں کا شکار ہے۔

محمد عاصم بٹ بڑا افسانہ اور بڑے کردار تخلیق کرنے پر قدرت رکھتے ہیں۔ ان کے سب کردار اپنا مرکز بنانے کی جستجو بھی رکھتے ہیں اور اس جستجو میں کبھی وہ کامیاب ہوتے ہیں اور کبھی تھک جاتے ہیں اور کبھی ہار۔ ان کے اکثر کردار فرد کی مجبوری، لاچاری، محرومی، کرب، اذیت، اضطراب، اکتاہٹ، آزادی پر قدغن، سماجی اصولوں سے بغاوت اور کہیں کہیں مذہبی اقدار سے بغاوت جیسی وجودی قدروں میں مبتلا نظر آتے ہیں۔

''تین گھبر'' کے تینوں مرکزی کردار عجیب سی کشمکش کا شکار ہیں۔ روزگار کی تلاش میں گھر سے نکلنے کے بعد نہ ہی تو وہ خود واپسی کا ارادہ رکھتے ہیں اور نہ ان کے گھر والوں نے انہیں کبھی واپس بلایا۔ ان کی زندگی کسی مقصد کے تحت گزرنے کی بجائے محض وقت گزارنے میں گزرتی ہے۔ وہ کسی بھی سیاسی نظریے کے حامی نہیں ہیں جبھی تو وہ دو متضاد سیاسی پارٹیوں کے سیاسی جلسوں میں شرکت کرتے ہیں اور دونوں کے حق میں نعرے مارتے دکھائی دیتے ہیں۔

یہ تینوں دن کو تماشائی ہوتے ہیں اور رات تنہائی میں خود تماشا بن کر رہ جاتے ہیں۔ دن کو بھرے مجمعوں میں بھی انہیں اپنی تنہائی کے سوا کچھ بھی نہیں نظر آتا۔ رات کی تنہائی میں اپنی ماؤں کو یاد کرتے ہیں اور بلک بلک کر روتے ہیں۔

''تیکھے نقوش والے گھبرو کو بھی اپنی ماں یاد آئی جو گاؤں میں اس کے انتظار میں بوہے پر نظریں جمائے رہتی تھی اور جس سے وہ کئی ماہ سے ملنے نہیں گیا تھا۔۔۔ وہ ہچکیاں لے کر دھیرے دھیرے رو دیا۔ تیسرا بھی دلاسہ دینا چھوڑ کر ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوئے پہلے تو منہ بسور تا رہا پھر اپنا گریہ نہ روک پایا۔۔۔ دکھ کی بھیگ نے ہر شے کو نم کر دیا۔''[10]

عاصم بٹ نے غم والم کو اس طرح سے برتا ہے کہ یہاں یہ کوئی خارجی شے نہیں بلکہ داخلیت کی، سچائی کی، یا ذاتی تجربے کی گہری آنچ بن کر ابھری ہے۔ یہ تینوں کردار دکھ میں جلتے بھی ہیں لیکن نہ کہیں دھواں کا پتہ ہے نہ شعلے کا۔ لیکن در حقیقت ان کی زندگی راکھ کا ڈھیر معلوم ہوتی ہے۔

''دائرہ'' کے کردار بھی گرے پڑے، کچلے اور مسلے ہوئے معمولی کردار ہیں، جو عاصم بٹ کے اکثر افسانوں میں نظر آتے ہیں۔ افسانے کے تمام کردار زندگی میں محبت، آسودگی اور روشنی کو ترستے نظر آتے ہیں۔ محرومیوں کے تسلسل نے انہیں زندگی سے بے رغبتی اور بیگانگی کی طرف مائل کر دیا ہے۔ زندگی کی لذتوں سے بے نیازی کے ساتھ ساتھ یہ لوگ آگے بڑھنے کی جستجو کو بھی کہیں کھو بیٹھے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبات و احساسات سے بالکل عاری یہ لوگ ماحول کی گھٹن اور زندگی کی تاریکی کے عادی ہو چکے ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ یہ لوگ اس قدر قناعت پسند ہیں کہ اس گھٹے گھٹے ماحول میں چپکے چپکے گزرتی بے آرزو زندگی میں بھی مطمئن نظر آتے ہیں۔ ایسے میں کبھی کبھی یہ کردار غیر انسان لگنے لگتے ہیں۔

اس افسانے کا مرکزی کردار جسے اپنا نام بھی ٹھیک سے یاد نہیں، ارشاد یا شاید دلشاد، اپنی زندگی کے نقطۂ آغاز ہی میں اپنی ماں کی مفارقت کی درد لے کر عازمِ سفر ہوا۔ باپ ردی فروش تھا۔ باپ کی دیکھا دیکھی یہ بھی ردی کا ساتھ وقت گزارنے لگا یہاں تک کہ ان دونوں کی حیثیت بھی بے کار ردی کی سی ہو جاتی ہے۔ بارہ چودہ سال کا ہوا تھا کہ باپ مردہ حالت اوندھے منہ اسے ردی سے ملا تھا۔ وہ اب تک جو ایک

طویل خواب کے عالم میں تھا، حقیقت کا کی تلخی ایک کڑواہٹ کی صورت اس کی زندگی میں سرایت کرنے لگی تھی۔ باپ کی ناگہانی موت اسے ادھورا کر گئی تھی۔ باقی رہی کسر بستی والوں نے پوری کر دی جب ایک دن اس نے دیکھا اپنے گھر کو مقفل دیکھا:

"اپنے معمول کے گشت کے بعد لوٹا تو اپنے گھر کے دروازے پر ایک قفل دیکھا۔ مجھے میری ردی اور نیم کا پیڑ تو ساتھ لے جانے کی اجازت دی جانی چاہیے۔ میں نے احتجاج کیا لیکن بے سود۔ خالی ہاتھ بستی سے نکل جانے کے سوا میرے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔"[11]

تنہائی زدہ اور واہموں کے شکار افراد کے مسائل پر غور و فکر کرنا، عاصم بٹ کا مرکزی مسئلہ ہے۔ انہوں نے زیدہ تر جدید دور کے انفرادی دکھوں اور انسان کی ازلی تنہائی کے احساس کو اظہار کی زبان دی ہے۔ وہ فرد کے مسئلہ اور معاشرے میں اس کی بقا کو بیان کرتے ہوئے تفکیری لب ولہجہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار تنہا جزیروں کی طرح ہیں۔ اپنے مسائل و مصائب کی وجہ سے خوابوں کا عمل دخل ان کی زندگیوں میں بہت گہرا ہے۔ یہ کردار کبھی ایسے خواب دیکھتے ہیں جن میں انہیں وہ کچھ حاصل کرنے کی سہولت میسر آتی ہے جسے وہ جیتی جاگتی زندگی میں حاصل نہیں کر پاتے۔

"اشتہار آدمی" کے افسانوں کی طرح "دستک" میں بھی ان کے اکثر کردار یا تو بے نام ہیں یا پھر ناموں کے ساتھ وارد ہوتے ہیں اور بے نام ہو کر کہیں دھند میں غائب ہو جاتے ہیں۔ وہ وقعت زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ان کے ہاں زندگی کی قبولیت کی بجائے زندگی سے اکتاہٹ، بیزاری اور فرار کا رویہ سامنے آتا ہے۔ وجودی تذبذب سے دوچار یہ کردار ہجوم میں ہوتے ہوئے بھی خود کو تنہا محسوس کرتے ہیں۔ سماج کا حصہ ہوتے ہوئے بھی، اس کا حصہ نہیں ہیں۔ وہ ٹکڑوں میں منقسم ہیں۔ عدم تحفظ کا شکار اور انجانے خوف میں مبتلا یہ کردار زندگی کی لغویت اور بے معنویت کا اعلان کرتے نظر آتے ہیں۔ اس مجموعے کے تقریباً سب ہی کردار بے ضرر ہیں، جو قاری میں نہ تو ہیجانیت اور نہ ہی تصادم پیدا کرتے ہیں۔ فقط معاشرے کے عکاس ہیں۔

حوالہ جات

[1] ڈاکٹر نوازش علی، "اشتہار آدمی اور دوسری کہانیاں: ایک جائزہ"، اسلام آباد، جون 1998ء، ص12

[2] عاقب شہزاد، "محمد عاصم بٹ کے فکشن میں وجودی عناصر"، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، 2018ء، ص113

[3] ایضاً، ص128

[4] محمد عاصم بٹ، "دستک"، شہرزاد، کراچی، 2009ء، ص8

[5] ایضاً، ص66

[6] ایضاً، ص69

[7] ایضاً، ص98

[8] نادیہ اشرف، "محمد عاصم بٹ کی علمی و ادبی خدمات"، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، 2015ء، ص46

[9] محمد عاصم بٹ، "دستک"، شہرزاد، کراچی، 2009ء، ص101

[10] ایضاً، ص169

[11] ایضاً، ص179